حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی

از

حضرت مولانا قاری محمد طیب

ماہنامہ دارالعلوم دیوبند
مئی ۱۹۵۶ء

مقالات

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح

(از حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ)

مرکزِ علمی دیوبند کے دینی اثرات کی تابناکیاں اور اس کے علمی و عملی کمالات کی ضوفشانیاں جب تک صفحۂ ہستی پر قائم ہیں اُس وقت تک حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی شخصیت اور اُن کے ہمہ گیر علم و فضل کی یاد بھی زندہ رہے گی، اس لئے کہ مولانا مرحوم کی ذات گرامی دیوبند کی تاریخ کا ایک ایسا جزء ہے جسے تاریخ سے الگ کرنا اپنے ناخن سے گوشت کو جدا کرنا ہے۔ افسوس ہے کہ ابتک نہ مولانا مرحوم کی کوئی سوانحعمری مرتب ہو سکی اور نہ ان کے مقالات و تقاریر کا کوئی مجموعہ سامنے آیا۔ یہ بڑی کوتاہی ہے جس کے ذمہ دار خود مولانا عثمانی سے تعلق رکھنے والے حضرات ہیں۔

لاہور سے ایک صاحب نے مخدوم و محترم حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کو اطلاع دی کہ وہ حیاتِ عثمانی پر کچھ ذخیرہ مرتب کر رہے ہیں اُنکی اس کتاب کے لئے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ بھی کوئی مضمون تحریر فرمائیں۔ افسوس ہے کہ یہ درخواست ایسے وقت میں پہونچی، کہ حضرت مہتمم صاحب ایک طویل سفر کے لئے پا در رکاب تھے، قلم برداشتہ چند صفحے آپنے اس موضوع پر تحریر فرمائے، ذہن کو فراغت و یکسوئی حاصل ہوتی تو علامہ عثمانی کی باکمال زندگی پر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے قلم سے کارآمد معلومات کا ذخیرہ صفحۂ قرطاس پر آجاتا، اب بھی جو کچھ ہے اِس سے مولانا عثمانی کی زندگی کے کئی پہلوؤں پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے +

(سید محمد ازہر شاہ قیصر)

حضرت الاستاذ علامہ شبیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح کے سلسلہ میں محترم عاشق عمر صاحب عباسی کا امر ہے کہ میں بھی سوانح نگاروں کی فہرست میں نام درج کرالوں۔ تعمیل امر سعادت ہے۔ لیکن حضرت علامہ کے مناقب کی فہرست اتنی طولانی ہے کہ ہم جیسے ناقص المعلومات افراد کی چند سطریں اُس کے چند عنوانات کا بھی حق ادا نہیں کر سکتیں۔ تاہم یہ کیا کم سعادت ہے کہ اُن کے سوانح نگاروں کی فہرست میں میرا نام ہی آجائے گو چند ناتمام سطریں ہی لکھ کر ہو جن میں کوئی خاص ترتیب یا مضمون نگارانہ تشکیل نہیں ہے، قلم برداشتہ ذکر محاسن کے طور پر جو بات بیساختہ ذہن میں آئی اور بات سے بات کی طرف ذہن منتقل ہوا اُسے سپرد کاغذ کردیا ہے۔ پس یہ سوانح، یا سوانح کا کوئی عرفی جز نہیں محض ایک تذکرہ ہے جس سے اپنی اور ناظرین کی تسلی اور تنشیط مقصود ہے۔ (وباللہ التوفیق)

حضرت علامہ میرے اُستاذ تھے اور میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے، مولانا اپنی جامعیت علوم کے ساتھ خصوصیت سے علوم عقلیہ سے طبعی دلچسپی رکھتے تھے، خود فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس سرہٗ کی تصانیف نہ دیکھ لیتا تو معلوم اعتزال کے کس گڑھے میں پڑا ہوا ہوتا، لیکن حضرت نانوتوی علوم نے مجھے سنبھالا۔ علوم عقلیہ سے پہلے سے دلچسپی تھی، حکمت قاسمیہ کے مطالعہ نے معقولات ایمانی کا رستہ دکھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا میں متکلم اور رنگ کا غلبہ ہوگیا۔ اسی لئے اسلام کے

اُصول و کلیات سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور اس موضوع پر اُن کا کلام نہایت بسیط اور محققانہ ہوتا تھا۔ ابتداء میں معقولات کی کتابیں، حمداللہ وغیرہ زیادہ پڑھاتے تھے۔ مگر آخر میں یہ تمام مشاغل ترک ہو گئے تھے اور صرف کتاب و سنت اور فنون دینیہ کا شغل باقی رہ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ بالآخر مولٰنا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی خدمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ قرآن شریف کے تفسیری فوائد لطیف و شیریں زبان اور شگفتہ طرز ادا کے ساتھ اُن کی قلمی کاوشوں کا شاہکار اور صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم آپ کی علمی محنتوں کا نچوڑ ہے، اس تفسیر و حدیث کی خدمت کے سلسلہ میں بہت سے اہم مسائل کا سہل عنوانات کے ساتھ حل فرما گئے ہیں، جس سے حضرت ممدوح کے علم کا اندازہ ہوتا ہے، تقریر و بیان آپ کا خاص حصہ تھا۔ قوۃ استدلال نہایت مضبوط اور مستحکم تھی، معمولی سی بات کو اس خوبصورتی اور قوۃ سے ادا کرتے تھے کہ وہ ایک اہم مگر حل شدہ مسئلہ نظر آنے لگتی تھی اور اُس کے تمام پہلو متانت کے ساتھ صاف ہو جاتے تھے، تحریر کا ایک خاص رنگ تھا جس میں نہ زمانۂ حال کی بے قید شوخی تھی نہ قدیم طرز کی کہنگی۔ حال کی فصاحت اور ماضی کی متانت سے ملا جلا رنگ تھا، جو آپ کی تحریر کا نمایاں پہلو تھا، بلاغت کلام کلام پر برستی تھی جو ہر طبقہ کے جذبات کو اپیل کرتی تھی۔ درس میں مضامین کو جامعیت اور استقصاء کے ساتھ ادا کرتے تھے، کلام میں بسط ہوتا تھا مگر غیر مہمل۔ ایک مسئلہ کو اُس کے تمام شقوق و جوانب کے ساتھ کھول لینے اور صاف کرنے کی روش تھی، اسی لئے درس میں کمیت پر نہیں کیفیت پر نظر رہتی تھی، سبق خواہ تھوڑا ہو مگر تام ہو۔ اسی لئے درس و تدریس کے سلسلہ میں وقت کے کچھ زیادہ پابند نہ تھے۔ تنقیح مسئلہ اور اُس میں تدبر و تفکر پر وقت زیادہ صرف ہوتا تھا مگر اسباق کا یہ تخلل اس لئے گراں نہ ہوتا تھا کہ ایک ہی دن کے درس میں کیفی طور پر کئی دنوں کے درس کا مواد فراہم ہو جاتا تھا اور کسر نکل جاتی تھی۔

میری ابتدائی تعلیم کے دوران میں حضرت والد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ سے خود ہی فرمائش کی کہ اسے معقولات میں پڑھاؤں گا، اور مجھے فرما دیا کہ منطق تجھے میں پڑھاؤں گا چنانچہ خصوصیت سے صغریٰ کبریٰ شروع کرائی اور مرقات تک پہونچے، گو یہ کتابیں بیچ میں رہ گئیں، لیکن جس قدر پڑھایا اوتنے ہی سے فن سے کافی مناسبت پیدا ہو گئی کیوں کہ اُنکی ابحاث کا نقطۂ نظر کتاب نہیں ہوتی تھی بلکہ فن ہوتا تھا اور طلبہ کو حسب استعداد فن سے مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔ احقر جبکہ متوسط کتابیں ہدایہ، جلالین وغیرہ پڑھتا تھا تو میں نے خود فرمائش کی کہ ترجمۂ قرآن شریف پڑھا دیجئے، دوسرے طلبہ بھی بکثرت شائق اور ملتجی ہیں۔ فرمایا کہ اول اول تو طلبہ شوق میں نام لکھا دیتے ہیں، اور پھر رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے آخر کار جماعت صفر کے درجہ میں رہ جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ کم از کم مجھ پر تو اطمینان فرمائیے نہ میں ناغہ کروں گا نہ بد شوقی دکھلاؤں گا، مگر آپ بھی پابندی فرما دیں۔ وعدہ فرما لیا۔ اور بڑی شفقت سے قرآن شریف کا درس شروع کرایا۔ ابتداء میں سو سوا سو طلبہ کا جمگھٹا جمع ہو گیا، مگر آخر کار وہی ہوا کہ طلبہ گھٹنے شروع ہوئے اور آخر میں میں تنہا رہ گیا۔ قدرتی طور پر مولانا کی تدریسی امنگ بھی کم ہو گئی اور ناغے بکثرت ہونے لگے۔ مگر میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اُس گھنٹہ میں مولٰنا جہاں بھی ہوتے میں وہیں پہونچ جاتا تھا، خواہ مکان پر یا دفتر میں یا کتب خانۂ مدرسہ میں، اور وہ گھنٹہ اُن کے پاس بیٹھ کر خاموشی سے گذار دیتا تھا۔ کبھی پڑھا دیتے کبھی عذر فرما دیتے۔ مگر میں یہ وقت اُن کے پاس پُورا ہی کر دیتا۔ آخر کار ایک دن فرمایا کہ بھائی میں ہار گیا اور تو جیت گیا، تو نے اپنی بات پُوری کر دکھائی۔

اخلاقی طور پر ایک خاص وصف یہ تھا جو بہت ہی اونچا تھا کہ ظاہر و باطن میں یکسانی تھی، وہ اپنے قلبی جذبات کے چھپانے یا اُن کے برخلاف اظہار پر قدرت نہ رکھتے تھے، اگر

کسی سے خوش ہیں تو ظاہر و باطن خوش، اور اگر ناخوش ہیں تو علانیہ اُس کا اظہار اُن کے چہرہ بشرہ سے ہوجاتا تھا اور کہہ بھی دیتے تھے۔ دارالعلوم کے معاملات میں اگر ذمہ داروں سے اُنہیں کوئی گرانی پیش آتی، اور حضرت مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم سے (جو اُن کے بڑے بھائی بھی تھے) کچھ رنجش ہوجاتی تو اکثر روٹھ کر بیٹھ جاتے یا سفر میں چلے جاتے، اُنھیں مناتے اور راضی کرکے لانے کے لئے اکثر میں مامور ہوتا تھا، کیوں کہ مجھ پر شفقت زیادہ فرماتے تھے ایک مرتبہ خفا ہوکر تھانہ بھون تشریف لے گئے تو یہ احقر وہاں گیا اور راضی کرکے لے آیا۔

ایک دفعہ ناخوش ہوکر گھر بیٹھ رہے اور مدرسہ میں آنا جانا ترک کردیا۔ حضرت مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے فرمایا کہ تو ہی جاکر لاسکتا ہے۔

میں حاضر ہوا، اور عرض معروض کی تو راضی ہوگئے، اور دارالعلوم میں چلے آئے۔ طبیعت اس قدر صاف تھی کہ جس وقت بھی بات اُن کے ذہن میں آجاتی تھی تو اُسی لمحہ گرانی رفع ہوکر حقیقتاً بشاشت چہرہ پر نمودار ہوجاتی اور ایسے خوش اور منفرح ہوجاتے کہ گویا کوئی گرانی ہی نہیں، ایک عالم دین کے لئے یہ وصف ایک عظیم مقام ہے کہ اُس کا ظاہر و باطن یکساں ہو، اور یہ تکلف نہیں بلکہ بلا تصنع و بناوٹ اُسکی قلبی رفتار ہی یہ ہو۔

حق تعالٰی نے علم و فضل کا ایک وافر حصہ عطا فرمایا تھا لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی بارہا دیکھا کہ اُن کے بڑوں نے اگر بھری مجلس میں بھی اُنھیں تہدید آمیز لہجہ سے کوئی بات کہی تو کبھی اُف نہیں کرتے تھے، اگر بات اُن کے نزدیک قابل تسلیم بھی نہوتی تب بھی اپنے اکابر کے حقوق کی رعایت فرماتے تھے۔

قلبی جذبات کو بالکل صفائی سے کہہ ڈالتے تھے خواہ وہ اپنی ہی کوئی کمزوری ہو۔

ایک بار ناخوش ہوکر گھر بیٹھ گئے۔ میں حسب معمول منانے کے لئے گیا، تو غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ بھائی .... نے مجھے مُردہ سمجھ لیا ہے، جو اس طرح سے مجھ سے قطع نظر کرلی، تو سُن لو کہ اس قطع نظر کرنے پر میرے دل میں دو قسم کے جذبے پیدا ہوئے ایک جذبہ نفسانیت سے اور ایک للّٰہیت سے نفسانیت سے تو یہ کہ اگر اُنہوں نے مجھے مُردہ سمجھ لیا ہے تو میں اُنہیں اپنی زندگی باور کراؤں اور اُس کا یہ اور یہ طریقہ ہوتا جو اُنھیں میری زندگی سمجھوا دیتا۔ دوسرا جذبہ للّٰہیت سے پیدا ہوا، اور وہ یہ کہ میں دیوبند سے کہیں باہر جاکر صحیح مسلم کی شرح لکھنے میں لگ جاؤں، میری طرف سے کچھ بھی ہوتا ہے نہ میں یہاں رہوں گا نہ یہ روز روز کی کوفت اُٹھانی پڑے گی۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت ان دونوں جذبوں میں سے کون سے کو آپ نے ترجیح دی ہے؟ فرمایا، للّٰہیت والے جذبے کو۔ میں نے کہا کہ الحمدللہ۔ مگر میں نے کہا کہ حضرت آپکے لئے تو اس میں بلاشبہ اجر ہے اور یہ نیت یقیناً پاک ہے مگر اس پر بھی تو دھیان فرمایئے کہ کیا اس قسم کی چھوٹی چھوٹی طبعی ناگواریوں سے جماعتی کام کا ترک کردیا جانا مناسب ہوگا جبکہ کاموں کا دارومدار آپ ہی جیسے حضرات کے اُوپر ہے اگر اسی طرح کل کو جماعت کے دوسرے بزرگ بھی ایسی ہی وقتی اور ہنگامی ناگواریوں کے سبب جو کبھی نہ کبھی آپ کی طرف سے اس میں پیش آجاتی ہیں، یہی فیصلے کرلیں کہ ہمیں کام چھوڑ دینا چاہیئے، تو فرمایئے کہ یہ کام آخر کس طرح چلے گا؟ اور اسے کون سنبھالے گا؟ میرے نزدیک تو آپ نے یہ اپنے کو یکسو کرنے کا فیصلہ نہیں فرمایا، بلکہ اس جماعتی کام کو ختم کردینے کا فیصلہ فرمایا ہے، کیا یہ مناسب ہے؟

بس اتنا سُنکر اکدم چہرے پر بشاشت آگئی، اور فرمایا ہاں یہ تو نے صحیح کہا، بس میں نے اب یہ دوسرا جذبہ بھی دل سے نکال دیا اور کل سے دارالعلوم پہونچکر کام کروں گا، چنانچہ علی الصباح حسب وعدہ تشریف لے آئے، اور ایسے

انداز سے آئے کہ گویا کوئی بات پیش ہی نہیں آئی تھی۔

یہ درحقیقت وہی ظاہر و باطن کی یکسانی، قلب کی صفائی اور حق پسندی کا اثر تھا کہ دل میں کبھی کچھ نہیں رکھتے تھے۔

بہر حال علم کے ساتھ حق تعالےٰ نے یہ خاص وصف عطا فرمایا تھا جس نے اُن کی بڑائی دلوں میں بٹھلادی تھی۔ قلبی طور پر استغناء اور ناز کی کیفیت کا غلبہ زیادہ تھا۔ کام کے سلسلہ میں جب تک کہ دوسروں کی طرف سے طلب اور کافی طلب ظاہر نہ ہوتی تھی، متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ کتب بینی اور مُطالعہ کا شغف بہت زیادہ تھا۔ خود بھی کبھی کبھی فرماتے کہ کام کیا کروں میں تو کتابوں کا کیڑا بنکر رہگیا ہوں۔ پھر بھی یہ واقعہ ہے، کہ تفسیری فوائد اور شرح مسلم جیسے دو اہم اور عظیم الشان کام یادگارِ زمانہ چھوڑے ہیں۔ اِس کے علاوہ بھی اعلیٰ ترین تصانیف "العقل والنقل"۔ "الاسلام"۔ "الشہاب الثاقب" "صدائے ایمان"۔ "اعجاز القرآن"۔ اور دوسرے مفید ترین رسائل و مسائل پر قلم زنی فرمائی اور حق یہ ہے کہ بیان مسائل کا حق ادا کردیا ہے۔ حضرت علامہ الاستاذ الکشمیری نوراللہ مرقدہٗ اُنھیں اسی لحاظ سے لسان الغیب فرمایا کرتے تھے۔ ذکاوت و ذہانت طبعی تھی، فہم تیز اور طبیعت وقّاد تھی۔ علم کی بُنیاد فہم ہی ہے، جب اُسے کتاب و سنت میں استعمال کیا گیا تو علم کا دہ چند ہوجانا قدرتی امر تھا۔ تحریر کی شگفتگی مسلّم تھی ایک ہی مضمون کئی آدمی لکھتے اور اُسی کو وہ قلمبند فرماتے، تو سب پر اُن کی تحریر کی شگفتگی نمایاں رہتی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے واپسیٔ مالٹا کے بعد ترکِ موالات کا استفتاء کیا گیا۔ حضرت نے اپنے تین ارشد تلامذہ حضرت مولٰنا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولٰنا محمد کفایت اللہ صاحبؒ اور حضرت مولٰنا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کیا کہ فتوٰی یہ حضرات مرتّب کریں اور غایت احتیاط و تدیّن سے فرمایا کہ انگریزوں کے بارہ میں مجھے اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہے، مجھ پر اُن کے بغض و عداوت کا غلبہ ہے، ہوسکتا ہے کہ فتوٰی میں جذبات کا رنگ آجائے، اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:-

ولایجرمنکم شنآن قوم	تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر
علیٰ ان لاتعدلوا اعدلوا	آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف سے
ھواقرب للتقویٰ۔	کام نہ لو، انصاف کرو کہ یہی تقویٰ
(قرآن کریم)	سے قریب تر ہے"۔

اِس لئے اس استفتاء کا جواب آپ تینوں حضرات لکھیں۔ چنانچہ تینوں حضرات نے قلمبند فرمایا، اور حضرت نے تینوں کے جوابات ملاحظہ فرماکر، حضرت مولٰنا شبیر احمد صاحبؒ کے جواب کے بارہ میں فرمایا کہ جواب تو ماشاءاللہ سب ہی بہتر اور جامع ہیں لیکن بھائی میں اگر لکھتا تو وہ اس کے قریب ہوتا جو شبیر نے لکھا ہے۔

بہر حال اُن کی تحریر کی جامعیت، شگفتگی اور بلاغت کو خود اُن کے اکابر بھی مانتے تھے، اور اُس کی کافی داد دیتے تھے

مولٰنا نظم اور شعر و شاعری سے بھی عاری نہ تھے، گو اس کا ذوق نہ تھا، چند مواقع ایسے بھی پیش آئے، کہ جذبات دلی کی ترجمانی آپنے نظم میں فرمائی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر "نالۂ دل" کے نام سے ایک نظم لکھی جو بہت پسند کی گئی۔ اور ایک بار میرے متعلق ایک نظم قلمبند فرمائی جس کا واقعہ یہ ہوا کہ میرا رشتہ رام پور میں مولوی محمود صاحب مرحوم رام پوری کے یہاں ہوچکا تھا، نکاح ابھی تک نہیں ہوا تھا کہ یہ میری اہلیہ جے پور اپنے تایا کے پاس گئی ہوئی تھی اور شدید علیل ہوئی، حالت نازک دیکھ کر غلطی، یا غلط فہمی سے وہاں سے کسی نے انتقال کا تار دے دیا جس سے یہاں دیوبند میں صفِ ماتم بچھ گئی، تیسرے دن تار پہونچا کہ وہ انتقال کا تار غلط تھا۔ اِس پر بساطِ شادی بچھ گئی اور تہنیتی جلسے گھروں میں اور مدرسہ میں ہوتے شروع ہوگئے۔

تقریباً پندرہ بیس دن تک جلسہ ہائے شیرینی و تہنیت کا سلسلہ قائم رہا۔ ان مجالس میں مختلف حضرات کی طرف سے مُبارکباد کی نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں، اس سلسلہ میں حضرت

مولٰنا نے بھی ایک جلسہ میں نہایت بلیغ نظم لکھی، اور سُنائی، جس کا واقعاتی شعر یہ تھا ؂

غلط اک تار برقی پہونچی تھی جے پور سے جس نے
جلایا آخر من مقصود کو برقِ تپاں ہو کر

اِس طرح کبھی کبھی کسی خاص محرک کے ماتحت نظم بھی کہہ لیتے تھے، مگر یہ چیز ذوق کے درجہ میں نہ تھی صرف ضرورت کے درجہ میں تھی اور طبیعت اس سے عاری اور عاجز نہ تھی۔

بہر حال حضرت علامہ کی ہستی تقریر، تحریر، نظم، نثر، علم اور فضل کی ایک مجسّم تصویر تھی، جس کے اُٹھ جانے کے بعد یہ مخصوص کمالات بھی گویا اُٹھ گئے۔ یوں حق تعالےٰ اپنے دین کا خود محافظ ہے، اور وہ شخصیتیں پیدا فرماتا رہے گا جو اس کے دین اور اُس کے نبی کے علم کو سنبھالتے اور تازہ بتازہ کرتے رہیں گے، لیکن جس کے سامنے علم وفضل کی ہستیاں اُٹھتی ہیں اُن کی نگاہوں میں تو اندھیر ہو جاتا ہے اور وہ جس قسم کے فضل وکمال سے مانوس اور مالوف ہوتے ہیں اُسکے اُٹھنے سے یہ پسماندہ بالیقین یتیم رہجاتے ہیں۔

آخر میں سیاسی لائنوں پر اُن سے جو اہم کام انجام پائے یہ بھی فی الحقیقت اُن کی زندگی کا ایک شاہکار تھا۔ یہ بات تو الگ ہے کہ اُن کی رائے سے بہت سے اکابر کو اختلاف تھا اختلاف رائے اپنی جگہ ہے اور اُس میں ہر شخص اپنی حجت سے مجبور ہے، لیکن عزم وعمل کی جو طاقتیں مولٰنا ممدوح سے پاکستان بننے سے پہلے، اور پاکستان بننے کے بعد ظاہر ہوئیں دوسرے اُنہیں خلاف توقع سمجھتے تھے، مگر حق تعالیٰ نے یہ حصّہ اُن کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ اُنہوں نے پاکستان بننے کے بعد دین اور علماء کو کافی سنبھالا۔ قدرت نے تنہا اُنہیں وہاں کی مرکزی شخصیت بنا دیا۔ اور اُس سے وہ کام لیا، جو مرکزی شخصیتوں سے لیا جا رہا ہے، آج اگر وہ زندہ ہوتے تو وہاں کے کاموں کی نوعیت کچھ اور ہوتی، یہاں کے لوگ اُن کی رائے سے تو اختلاف رکھتے تھے مگر اُن کے جذبات اور صدق وخلوص کی قدر بھی کرتے تھے، اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگر اختلاف رائے کے حیلہ سے حضرت ممدوح وہاں نہ پہنچتے تو دین کا جو کام ہوا بظاہر اسباب وہ نہ ہو سکتا۔ غرض مجموعی حیثیت سے حضرت علامہ کی شخصیت ایک ممتاز ترین شخصیت تھی جس کے علم وفضل کا سکہ ملک بھر نے مانا ہوا تھا۔ اور بیرونی ممالک میں بھی اس کا شہرہ پہونچا ہوا تھا، جس کے سامنے اہلِ علم وفضل سر جھکانا اپنے لئے فخر سمجھتے تھے۔

اُن کے تفسیری فوائد کا حکومت افغانستان کی طرف سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا جانا اور ان فوائد کا انتخاب عمل میں آنا درحقیقت اُن کے فضل وکمال کے سامنے جھک جانا تھا۔ فتح الملہم کو علامہ زاہد کوثری مشہور فاضل مصر کا خراج تحسین ادا کرنا ہی اُن کے فضل وکمال کا اعتراف تھا۔ بہر حال جہاں جہاں بھی اُن کے فضل وکمال کا کوئی اثر پہونچا وہیں اعتراف وتسلیم کا شیوہ بھی اختیار کیا گیا۔ اس طرح حضرت مولٰنا کی شخصیت صرف ہندوستان ہی کے لئے سرمایۂ ناز نہ تھی بلکہ دُنیائے اسلام کے لئے سرمایۂ نازش تھی۔

اگر اس طرح سے قلم چلاتا ہوا چلا جاؤں جس طرح سے وہ بے ساختہ چل رہا ہے اور اس مجلس میں چند سطور سپرد قلم ہو گئیں تو ممکن ہے کہ قلم چلتا ہی رہے اور بات پر بات یاد آتی چلی جائے، مگر سوء اتفاق سے وقت ختم کیا، میں بہار کے سفر کے لئے پا برکاب ہوں، ریل کا وقت آگیا، اِس لئے قلم کو روک دینا پڑا۔ اگر قلم چلتا ہی رہتا تب بھی مناقب کی طولانی فہرست پوری نہ ہو سکتی اور اُسے رُک جانا ہی پڑتا۔ اِس لئے اگر ابھی رُک گیا تو مضائقہ نہیں تکمیلِ فہرست، نہ جب ہوتی نہ اب، اِس لئے یہ چند سطور بیساختگی کے ساتھ حافظہ سے باہر آگئیں اور محترم عاشق صاحب کے حکم کی تعمیل ہو گئی اور میں بھی اس حیلہ سے مولٰنا کے سوانح نگاروں کی فہرست میں شامل ہو گیا، جو میرے فخر کے لئے کافی ہے ٭